بسم اللہ الرحمن الرحیم

نظرات

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے اپنے ماہنامہ "البلاغ" کراچی میں ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی اسلام آباد کو ان کے خیال میں جو کام کرنے چاہیئں، ان کے بارے میں کچھ ارشادات فرمائے ہیں۔ حضرت مفتی صاحب کی علمی و دینی شخصیت ہمارے لئے ہمیشہ قابل احترام رہی ہے اور ان کی آراء کو، باوجود ان میں سے بعض سے شدید اختلاف کے، ہم نے بڑی عزت سے دیکھا اور انہیں سمجھنے اور ان میں سے بعض پر حتی الوسع عمل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور وہ اس لئے کہ ایک تو یہ آراء ایک راسخ العقیدہ عالم دین کی سوچی سمجھی اور عمر بھر کی علمی و تدریسی زندگی کے تجربے کی حامل آراء ہوتی ہیں۔ دوسرے مفتی صاحب کی نکتہ چینی کے پیچھے بعض دوسرے علماء کی طرح حزبی سیاست یا زیادہ صحیح الفاظ میں سیاسی ایجی ٹیشن کے محرکات نہیں ہوتے۔ وہ ایک عالم دین ہیں۔ دین کے نام سے سیاسی ایجی ٹیشن کرنے والے نہیں۔ پھر ان کا بات کہنے کا انداز علمی و سنجیدہ ہے۔ اور اعتراض کرتے وقت وہ اس سطح پر نہیں اُترتے، جو آج بہت سے علماء دین کو بہت پسند ہے۔

جہاں تک ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی کے سابق ڈائرکٹر کا تعلق ہے، وہ ورق تو الٹا جا چکا۔ اس لئے اس ضمن میں حضرت مفتی صاحب نے جو کچھ لکھا ہے، ہم اس بارے میں کچھ نہیں کہیں گے۔ باقی ادارہ کے کام کے متعلق جو کچھ انھوں نے ارشاد کیا ہے، ہم صرف اس کے بارے میں یہاں کچھ معروضات پیش کرنا چاہتے ہیں۔
ملک و ملّت کے جن مسائل کا حل، بقول مفتی صاحب، اس ادارہ کو تلاش کرنا چاہیئے، ان کے دو حصے ہیں۔ "پہلا حصّہ تو وہ مسائل ہیں، جو حقیقت کے اعتبار سے وقت کا کوئی تقاضا نہیں بلکہ وہ مصنوعی تقاضا

اس لئے بن گئے کہ انگریز کی لادینی حکومت نے صرف اپنے قومی امتیازات کو قائم رکھنے کے لئے اپنے قومی مزاج کے مطابق کھیل اور تفریح سے لے کر عام معاشرت، رہن سہن، طعام ولباس، میل ملاقات میں پھر حکومت کے اداروں میں ایسے قواعد اور قوانین جاری کر دیئے، جو مشرقی تہذیب اور اسلامی معاشرت سے قطعاً بیگانہ بلکہ متضاد ہیں۔ ان کے یہاں ستر پوشی، حیا و شرم، مرد و عورت میں محرم وغیر محرم کا امتیاز کوئی اہمیت نہیں رکھتے جب کہ مشرق کا مزاج خصوصاً اسلام کی تعلیمات اس سے سراسر مختلف ہیں۔۔۔۔۔"

معلوم ہوتا ہے یہاں مفتی صاحب کی مراد اس بے حیائی سے ہے، جو اُن کے خیال میں انگریز کی لادینی حکومت کے نتیجے میں ہمارے ہاں عام ہوگئی ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں مفتی صاحب فرماتے ہیں:" ادارہ کے کرنے کا کام یہ ہے کہ ان غلط رسموں اور بے حیائی کی معاشرت کے نتائج بد اور ان سے پیدا ہونے والے اخلاقی جرائم اور بدامنی اور قتل وغارت تک پہنچنے والے اثرات سے خود اپنی قوم کو بھی آگاہ کرے اور مغربی اقوام کو بھی۔۔۔۔۔"

بے شک یہ کام کرنے کا ہے۔ اسے ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی کرے یا کوئی اور تنظیم، لیکن اس سلسلے میں مفتی صاحبؒ نے یہ جو فرمایا ہے:" کیا موجودہ زمانے کے ترقی یافتہ ممالک چین وغیرہ کی مثالیں ہمارے سامنے نہیں۔۔۔" تو اس کے متعلق ہم عرض کریں گے کہ بے شک چین میں پہلے بے حیائی آخری حد کو پہنچ چکی تھی اور اس قسم کی وہاں اور بھی بہت سی خرابیاں تھیں، لیکن چین کی انقلابی حکومت نے اپنے ملک کو ان برائیوں سے کس طرح پاک کیا، اور مفتی صاحب کے الفاظ میں اس نے کیسے ایک زندہ قوم کی حیثیت میں دنیا سے اپنا لوہا منوالیا" موصوف کو اس پر بھی کچھ روشنی ڈالنی چاہئے تھی۔ چین اب کمیونسٹ ہے اور اپنے پرانے مذاہب بدھ مت اور کنفوشس کے بجائے مارکسزم لینزم کی صحیح تعبیر ماؤزم کو بطور ایک مذہب کے مانتا ہے۔ پھر انقلاب سے پہلے وہاں مرد و عورت میں محرم وغیر محرم کا بڑا امتیاز تھا اور عام طور پر عورت گھر سے باہر نہیں نکلتی تھی، لیکن اب چین میں مرد و عورت میں مکمل مساوات ہے، یورپی ملکوں سے کہیں زیادہ۔ نہ اب وہاں پہلے کی طرح پردہ ہے اور نہ مرد و عورت کی زندگی کے الگ الگ خانے۔ دونوں شانہ بہ شانہ ہر شعبۂ حیات میں کام کرتے نظر آتے ہیں۔ بلکہ دونوں کا لباس بھی کم بیش ایک سا ہے۔

مفتی صاحب کے نزدیک" مسائل کا دوسرا حصہ وہ ہے، جن کا تعلق ہمارے اقتصادی، معاشی اور

دفاعی معاملات سے ہے، جن میں ہمیں بین الاقوامی سطح پر کام کرنا ناگزیر ہے۔ ان میں ہم ساری دنیا سے الگ تھلگ ہو کر اپنا نظام زندگی نہیں چلا سکتے۔"

اس سلسلے میں مفتی صاحب نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے، اس کا خلاصہ مطلب یہ ہے۔ علوم جدیدہ کے ماہرین تو یہ بتائیں کہ موجودہ زندگی کے ڈھانچے میں کام چلانے کے لئے کون سی معمولی اور جزوی تبدیلیاں کی جائیں "جو اسلامی تعلیمات سے متصادم نہ ہوں اور بین الاقوامی سطح پر قابل عمل ہوں" اور اہل تحقیق علماء کا کام یہ بتانا ہوگا کہ ایسی وقتی ضرورتوں کے لئے اسلامی تعلیمات کے اصول وفروع میں کس حد تک سہولت دی جاسکتی ہے۔ مفتی صاحب چاہتے ہیں کہ ادارہ ان دونوں گروہوں پر جامع ہو، بلکہ "وہ ملک کے دوسرے ماہرین اور اہل فتویٰ علماء کے مشورے اور تعاون کے ساتھ مسائل کا حل تلاش کرے . . ."

پھر یہ بھی ارشاد ہوا ہے "ہماری زندگی میں بے شمار چیزیں ایسی ہیں کہ اگر ان میں آزادانہ غور وفکر کر کے تھوڑی سی تبدیلی کر لی جائے تو وہ نہ صرف اسلام کے مطابق ہو سکتی ہیں، بلکہ انسانیت کے لئے زیادہ مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔ ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی کا اصل کام یہ ہے کہ وہ زندگی کے مغربی ڈھانچے کو جوں کا توں برقرار رکھ کر اسلام میں تبدیلی نہ کرے، بلکہ اسلام کو اس کی اصلی شکل میں برقرار رکھ کر زندگی کے مغربی ڈھانچے میں ایسی تبدیلیاں تجویز کرے جن پر عمل کر کے مسلمان ایک باعزت اور خوددار قوم کی طرح ترقی کے میدان میں آگے بڑھ سکیں۔"

اس ضمن میں مفتی صاحب نے اسی قسم کی اور بھی باتیں فرمائی ہیں۔ مثلاً ارشاد ہوتا ہے "عالمگیر مسائل میں محض انفرادی رائے سے کوئی فیصلہ کرنے کے بجائے جب بھی کسی مسئلہ کی تحقیق مقصود ہو، اس میں ملک کے تمام اہل بصیرت اور معتمد علماء سے پوری نیک نیتی کے ساتھ مشورہ کیا جائے اور ان کے مشورے اور تعاون سے مسائل کا حل تلاش کیا جائے۔" اس سے کچھ آگے موصوف فرماتے ہیں: "اسی طرح جو مسائل جدید علوم وفنون سے متعلق ہوں، ان میں جدید علوم کے ماہرین سے اسی طریقے پر استصواب رائے ہونا چاہیئے . . ."

اب ہم مفتی صاحب کے ان ارشادات کے متعلق کچھ عرض کریں گے۔

سب سے پہلے تو یہ بات جاننے کی ہے کہ اگر مسائل کو محض نظری اعتبار سے ہی زیر بحث لایا جائے تو بحث طویل سے طویل تر ہوتی جاتی ہے اور اس سے کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ اس لئے بہتر یہ ہوتا ہے کہ کوئی ٹھوس اور موجود مسئلہ لے لیا جائے اور اس کی کسوٹی پر نظری دعووں کو پرکھا جائے۔

اب پاکستان میں کثرت آبادی کے مسئلے کو لیجئے۔ یہ ایک خالص معاشیات کا مسئلہ ہے اور جدید علوم کے ماہرین بتاتے ہیں کہ اگر ملک میں آبادی اسی طرح بڑھتی رہی اور اسے روکا نہ گیا تو ملک کے وسائل اس روزافزوں آبادی کے لئے ناکافی ہوجائیں گے اور خواہ ہم زراعت اور صنعت میں کتنی بھی ترقی کریں، ہمارے ہاں بے کاری، احتیاج اور معاشی پستی، بلکہ فقروفاقہ زیادہ سے زیادہ ہوتا جائے گا اور ایک وقت آئے گا کہ یہ زمین آبادی کے لئے تنگ ہوجائے گی۔ اب جدید علوم وفنون کے ماہر خاندانی منصوبہ بندی کے تحت آبادی کو ایک حد میں رکھنے پر زور دیتے ہیں اور اس کے لئے وہ اعداد و شمار بھی پیش کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں اسلامی تعلیمات کے اصول و فروع سے یہ بھی ثابت کیا جاتا ہے کہ ان میں خاندانی منصوبہ بندی کے لئے سہولت موجود ہے۔ پھر دوسرے مسلمان ملکوں کے، جہاں کثرت آبادی کا مسئلہ ہم سے بھی زیادہ سنگین ہے، جیسے کہ مصر، متبحر اور مسلّمہ علماء کے خاندانی منصوبہ بندی کے جواز کے فتوے بھی موجود ہیں۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود ہمارے ہاں کے اکثر علماء اس کے خلاف مہم چلانے میں لگے ہوئے ہیں۔ اور اس محاذ پر انھوں نے حکومت پاکستان کے خلاف لڑائی شروع کر رکھی ہے۔

اس سلسلے میں جب ملک اور بیرون ملک کے بعض علماء کی یہ رائے پیش کی جاتی ہے کہ اسلامی تعلیمات کے اصول وفروع میں خاندانی منصوبہ بندی کی سہولت موجود ہے تو انہیں "اہل بصیرت اور معتمد علماء" کے زمرے سے خارج قرار دیا جاتا ہے۔ اور اگر جدید علوم کے ماہر اپنے ٹھوس علم کی بنا پر اس کی شدید ضرورت واضح کرتے ہیں تو ان کی رائے یہ کہہ کر رد کر دی جاتی ہے کہ وہ مغرب زدہ ہیں اور اسلام کے نظامِ فکروعمل سے بیزار ہیں۔

ہم حضرت مفتی صاحب سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ اس مسئلے میں حکومت کیا کرے اور کس کی بات مانے۔ کیا ایسے مسائل میں جدید علوم کے ماہرین اور مفتی صاحب کے تجویز کردہ "اہل بصیرت اور معتمد علماء" میں مفاہمت کی کوئی صورت ممکن ہے؟ خاندانی منصوبہ بندی حکومت کے طے شدہ پروگرام میں داخل ہے۔ اس ضمن میں حکومت کے سامنے مصر کی مثال موجود ہے، جہاں بڑے زور شور سے اس پروگرام پر عمل ہوتا ہے کیونکہ وہاں اس کی ضرورت ہم سے زیادہ ہے۔ مصر کے بعض علماء ممکن ہے انفرادی طور پر اسے شرعاً ناجائز سمجھتے ہوں لیکن وہاں کے علماء نے اس بنا پر اپنی حکومت کے خلاف محاذ قائم نہیں کر رکھا، جیسے پاکستان میں ہمارے علماء نے قائم کر رکھا ہے۔ اب اگر ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی یہ حقائق سامنے لاتا ہے اور اسلامی تعلیمات کے اصول و فروع سے یہ بتاتا ہے کہ خاندانی منصوبہ بندی کے لئے ان میں سہولت موجود ہے تو مفتی صاحب یہ فتویٰ دے دیتے ہیں کہ ادارہ قرآن وسنت میں تحریف وتاویل کا دروازہ کھول رہا ہے۔

اس کے بعد دوسرا مسئلہ عائلی قوانین کا ہے۔ صنعتوں کے فروغ اور دیہاتی زندگی میں شہریت کے عناصر داخل ہونے (URBANISATION) سے ہماری معاشرت میں دُور رس تبدیلیاں آرہی ہیں۔ اس کی وجہ سے خاندانی زندگی سے متعلق قوانین میں تھوڑی بہت اصلاح لازمی ہوگئی تھی۔ حکومت پاکستان نے اس سلسلے میں عائلی قوانین نافذ کیے۔ اس طرح کے قوانین تقریباً تمام مسلمان ملکوں میں نافذ کئے جارہے ہیں۔ اور ایسا یورپ سے مرعوب ہو کر نہیں کیا جارہا، کیونکہ اب تو ان ملکوں سے یورپ کا سیاسی تسلط ختم ہو چکا ہے۔ دراصل مسلمان اقوام کی نئی معاشرت کے لئے اس طرح کے قوانین ضروری ہیں اور ان کی حکومتیں مجبور ہیں کہ وہ انھیں نافذ کریں۔

یہ عائلی قوانین پاکستان میں نافذ ہوئے۔ ہمارے علماء کی غالب اکثریت نے انھیں قرآن وسنت کے خلاف بتایا۔ اور ان کی مخالفت میں قلم و زبان دونوں سے کام لیا، ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی نے ایک طرف ان عائلی قوانین کی تائید میں قرآن وسنت سے شواہد پیش کیے اور دوسری طرف یہ بتایا کہ دوسرے مسلمان ملکوں میں جہاں ہم جیسا ہی دینی شعور ہے اور اہل تحقیق علماء بھی موجود ہیں، وہاں اسی قسم کے قوانین نافذ کیے جارہے ہیں اور علماء کی طرف سے ان کی مخالفت نہیں ہورہی بلکہ وہ بھی ان کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔

اب مفتی صاحب کے نزدیک ادارہ کی اس طرح کی کوششوں کا مقصد صرف مغربی نظام زندگی کو سراسر حق وصواب ثابت کرنا ہے۔ اور ان کا خیال ہے کہ اگر ادارہ کو اسلام اور مسلمانوں کے لئے مفید ہونا ہے تو اسے چاہیئے کہ وہ ان تمام اصلاحی اقدامات کی مخالفت کرے جو اب تک حکومت پاکستان کرچکی ہے۔ اسی صورت میں ادارہ کو علماء کا اعتماد حاصل ہوگا اور بقول مفتی صاحب "تمام مسلمان افتراق و انتشار کی افسوس ناک صورت حال سے نجات پاکر یکسوئی اور یک جہتی کے ساتھ تعمیری خدمات انجام دے سکیں گے"۔

اب بینکنگ کو لیجیئے۔ ایک وقت تھا، پورے برصغیر میں مسلمانوں کا کوئی بنک نہ تھا اور بینکنگ کا کام جاننے والے مسلمانوں میں خال خال تھے۔ اب پاکستان میں بینکنگ ایک بہت بڑی صنعت ہے، جس میں لاکھوں آدمی کام کرتے ہیں۔ بے شک اس نظام میں خرابیاں ہیں، ان کو دُور کرنا چاہیئے۔ اور اس میں جو استحصال کے راستے ہیں ان کا سدِّباب ہونا چاہیئے، لیکن یہ کہ جیسا مولانا مودودی صاحب کہتے ہیں، موجودہ بینکوں میں نوکری کرنا ایسا ہے، جیسے شراب خانے اور قحبہ خانے میں نوکری کی جائے، یقیناً ادارہ نے اس کی مخالفت کی۔

اس کی رائے یہ تھی کہ بینک کا منافع "ربا" نہیں کہ اس پر فرمودہ خداوندی "فاذنوا بحرب من اللہ ورسولہ" کا اطلاق ہو۔ باقی مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ ادارہ "سود کو حلال قرار دینے کے لئے کھینچ تان کرنے کا مرتکب ہوا، وہ ہمیں معاف فرمائیں، صحیح نہیں۔ ادارہ نے "ربا" کو جسے قرآن مجید نے حرام قرار دیا ہے، حلال نہیں کہا۔ البتہ اس کی تحقیق یہ تھی کہ بینک کا منافع "ربا" نہیں۔ اور اس کی تائید میں اس کی طرف سے شواہد پیش کئے گئے۔ ادارہ کی یہ تحقیق انوکھی نہ تھی۔ عصرِ حاضر کے کئی ممتاز علماء اسی نتیجے پر پہنچے ہیں۔

مفتی صاحب نے ادارہ کے خلاف جو فردِ جرم لگائی ہے، اس میں "ذبیحہ" کا بھی ذکر ہے۔ ہم ان کی خدمت میں عرض کریں گے کہ اس بارے میں ادارہ کے اظہارِ خیال سے بہت پہلے خود مفتی صاحب نے مشینی ذبیحہ کے بارے میں رائے دی تھی۔ جس پر مولانا مفتی محمود صاحب نے ان کی اتنی ہی سخت گرفت کی تھی، جتنی وہ اس وقت ادارہ کی کر رہے ہیں۔

مفتی صاحب نے اپنے مضمون میں یہ بات ایک سے زیادہ بار دہرائی ہے کہ عالمگیر مسائل میں انفرادی رائے کو پوری امت پر مسلّط نہ کیا جائے اور یہ کہ ملک کے دوسرے ماہرین اور اہلِ فتویٰ علماء کے مشورے اور تعاون کے ساتھ مسائل کا حل تلاش کیا جائے۔ جہاں تک حضرت مفتی صاحب کا یہ ارشاد ہے کہ انفرادی رائے کو لوگوں پر مسلّط نہ کیا جائے، تو یہ بالکل صحیح ہے اور اس کی اصابت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ کیونکہ کسی رائے کو عملاً نافذ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ جن لوگوں پر اس کا نفاذ ہوگا، ان کی فعّال رائے عامہ اس کے حق میں ہو۔ لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ کسی مسئلہ کے متعلق خواہ وہ عالمگیر مسائل میں سے ہی کیوں نہ ہو، انفرادی رائے کے اظہار کی اجازت نہ دی جائے۔ تاریخ میں اکثر ایسا ہوا ہے کہ شروع میں ایک انفرادی رائے ہوتی ہے۔ بعد میں اسے آہستہ آہستہ دوسرے قبول کرتے جاتے ہیں، یہاں تک کہ وہ رائے عامہ بن جاتی ہے۔ اب اگر آپ انفرادی رائے کے اظہار پر پابندی لگاتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ سوچنے کی صلاحیتوں کو ہی سرے سے مسلوب کرنا چاہتے ہیں، اور یہ ذہنی موت نہیں تو اور کیا ہے۔

اس سلسلے میں یہاں ہم علامہ اقبال کی تصنیف "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ" سے ایک اقتباس دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں: "اب اگر قانون کی دنیا میں قدم رکھیئے تو اسلام کی روح (اسلام کی روح بڑی وسیع ہے۔ اتنی وسیع کہ اس کی کوئی حدود ہی نہیں) اور بھی نمایاں طور پر ہمارے سامنے آجائے گی۔ چنانچہ اسلام کے ولندیزی مبصّر پروفیسر ہرگرونجے نے بھی لکھا ہے کہ "جب ہم اسلامی قانون کے نشوونما کا مطالعہ بہ نگاہِ تاریخ کرتے ہیں

توجہاں یہ دیکھتے ہیں کہ فقہائے اسلام ذرا ذرا سے اختلافات میں ایک دوسرے کو مورد الزام ٹھہراتے، بلکہ انہیں ملحد قرار دیتے ہیں۔ وہاں یہی حضرات اپنے پیش روؤں کے اختلافات کو اس لئے سلجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان میں زیادہ سے زیادہ اتحاد اور یک جہتی پیدا ہو سکے"

اور یہ تو مشہور ہی ہے کہ ایک دَور میں جسے ملحد و زندیق قرار دیا گیا بعد کے دَور میں اکثر اسے مجدد اور امام مان لیا گیا اور تاریخ اسلام میں اس کی سینکڑوں مثالیں موجود ہیں۔

علامہ اقبال اس کے بعد بڑے افسوس سے لکھتے ہیں کہ" بدقسمتی سے اس ملک (غیر منقسم ہندوستان) کے قدامت پسند مسلم عوام کو ابھی یہ گوارا نہیں کہ فقہ اسلامی کی بحث میں کوئی تنقیدی نقطہ نظر اختیار کیا جائے۔ وہ بات بات پر خفا ہو جاتے اور ذراسی تحریک پر بھی فرقہ وارانہ نزاعات کا دروازہ کھول دیتے ہیں"

قبلہ مفتی صاحب نے مسلمانوں کو آج جن مسائل سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے، انہیں حل کرنے کے لئے اس بات پر بہت زور دیا ہے کہ علوم جدیدہ کے ماہرین کے علاوہ اہل فتویٰ، اہل بصیرت اور معتمد علماء سے مشورہ کیا جائے اور اُن کا تعاون حاصل کیا جائے۔ اگر ان امور میں علوم جدیدہ کے ماہرین اور اہل بصیرت کا اس طرح تعاون ہو سکے، تو اس ملک کے لئے اس سے بڑی کیا نعمت ہو سکتی ہے۔

اب یہ واقعہ ہے کہ ان دو گروہوں میں اس وقت تک اس مقصد کے لئے تعاون کی کوئی صورت نہیں نکلی۔ اس میں قصور کس کا ہے؟ اس بارے میں ہم کچھ کہنے کے بجائے ایک ممتاز عالم دین مولانا مفتی امجد العلی کی رائے یہاں نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ مولانا موصوف نے "فکر و نظر" میں "تشکیل قوانین اسلامی کے مراحل" کے موضوع پر کئی قسطوں میں ایک مضمون لکھا تھا۔ اس کے آخر میں مولانا موصوف نے اس امر پر روشنی ڈالی تھی کہ آج کے دَور کی جملہ قانونی ضرورتیں شریعتِ اسلامی کی رو سے کس طرح پوری کی جا سکتی ہیں۔ اس ضمن میں انھوں نے اس رائے کا اظہار کیا تھا کہ موجودہ دَور میں ایک فقہی مذہب میں محصور ہو کر ہم اپنی قانونی ضرورتیں پوری نہیں کر سکتے۔ کیونکہ بعض مسائل کے بارے میں ایک مذہب میں وسعت ہے اور دوسرے میں تنگی۔ اسی وجہ سے بہت سے اسلامی ممالک میں موجودہ حالات کے لئے جو قوانین بنائے جا رہے ہیں، ان میں تمام مذاہب فقہ سے یکساں طور پر استفادہ کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں پہل دولتِ عثمانیہ نے کی۔ اس کے بعد دوسرے مسلمان ملکوں نے بھی اسی طریقے کو اختیار کیا۔ (باقی صـ۳۸۸ پر)

Fikr-o-Nasar (Islamabad) 6:5 (1968)

اسلام میں نظام عدل گستری*

پروفیسر عبدالحفیظ صدیقی

تاریخ ہند کا وسطی دَور دراصل مسلمانوں کی حکومت کا زمانہ ہے اور اسی لئے وسطی دَور کا نظام عدل گستری مسلمان حکمرانوں کے نظم ونسق کا ایک ضروری جزو ہے۔ گو قرون وسطیٰ کے مسلمانوں نے شمالی ہند اور دکن میں نظام عدل گستری کو اپنے خاص انداز میں ڈھالا اور اس میں جدید ماحول کے مطابق مناسب تبدیلیاں کیں، لیکن اسے ٹھیٹ ہندوستان کی پیداوار سمجھنا صحیح نہ ہوگا۔ یہ ادارہ بہت دُور سے یہاں آیا تھا۔ اس کی بہت بڑی تاریخ ہے اور اس کا مطالعہ بڑی دلچسپی اور اہمیت رکھتا ہے۔ بات یہ ہے کہ اسلامی نظام عدل گستری کا اصلی سرچشمہ عرب ہے۔ اس کے بعد بغداد اور ترکستان میں اس کی پرورش ہوئی اور پھر ترکستان کے راستے سے یہ ہندوستان آیا۔ اسلامی عدل گستری کے ادارت بّری راستوں سے شمالی ہند آئے اور پھر خلجیوں اور تغلقوں کے ذریعہ دکن پہنچے۔ دکن کی سرزمین پر امیران صدہ، سلطنت بہمنی اور پھر بیجا پور، احمد نگر، برار، بیدر اور گولکنڈے کی سلطنتوں نے عدل گستری کے ان ادارات سے اپنے نظم و نسق کو آراستہ کیا اور تفصیلی حیثیت سے ان میں بہت سے اضافے کئے۔ اگرچہ سلاطین دہلی اور خصوصاً وسطی دکن کا نظام عدل گستری ہمارا موضوع بحث ہے لیکن اس کا مطالعہ کرنے سے پہلے یہ پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ اسلامی عدل گستری کا اصل سرچشمہ کیا ہے؟ خلفاء راشدین، بنو امیہ اور بنو عباس کا اس میں کس قدر حصّہ ہے۔ پھر شمالی ہند آنے کے بعد اس میں کیا تبدیلیاں اور اضافے ہوئے اور دکھنی ماحول میں اس کی کیا صورت گری ہوئی؟

مملکت، حکومت اور اقتدار اعلیٰ

چونکہ عدل گستری کی سوتیں قانون، اقتدار اعلیٰ اور مملکت سے پھوٹتی ہیں اور جب تک قانون، اقتدار

---

* ادارہ تحقیقات اسلامی کی طرف سے "برّصغیر پاک وہند میں اسلامی نظام عدل گستری" نام کی ایک کتاب زیر طبع ہے، یہ مضمون اس کتاب کا ایک باب ہے۔ (مدیر)

اعلیٰ اور مملکت کے صحیح تصورات روشنی میں نہ آجائیں، عدل گستری کی ماہیت سمجھ میں نہیں آسکتی۔ اس لئے اسلامی عدل گستری کی وضاحت سے پہلے یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ مملکت اقتدار اعلیٰ قانون اور حکومت کے متعلق اسلام کا حقیقی تصور کیا ہے؟ یہ کہا جاسکتا ہے کہ پہلی اسلامی مملکت عہد نبوی میں قائم ہوئی اور یہ ایک نئے تصورِ حیات اور ایک بلند نصب العین کے ساتھ قائم ہوئی۔ اس کا اوّلین مرکز مدینہ تھا، جہاں مکہ کے مہاجر، مدینہ کے مسلمان اور مدینہ کے غیر مسلم عرب اور یہودی قبیلے سب ہی اس مملکت میں شامل ہوگئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان چار طبقوں نے مل کر جو سیاسی تنظیم قائم کی تھی، اس کی نوعیت ایک وفاقی شہری مملکت کی سی تھی۔ حُسنِ اتفاق سے اس کا دستور تحریری شکل میں محفوظ رہ گیا[۱] یہ اسلام کا پہلا سماج اور پہلی مملکت ہے جو سیاست کے بلند تصوّرات کے ساتھ قائم ہوئی۔ اس کے سیاسی اعضاء ہم آہنگ کئے گئے اور افراد مملکت کو ایک سیاسی رشتے میں منسلک کیا گیا۔ اس کی ابتدا مدینہ سے ہوئی لیکن رفتہ رفتہ تمام جزیرہ نمائے عرب اس تنظیم کے تحت آگیا اور خلیفہ سوم کے زمانے تک اسلامی مملکت بحر خزر اور افریقہ تک پہنچ گئی۔

قرآن، حدیث، فقہاء کے اجتہاد اور صدیوں کے عملدرآمد کو دیکھا جائے تو مملکت کی ابتدا کے متعلق اسلام کا یہ تخیل معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تشکیل ایک سماجی ضرورت پر مبنی ہے اور بغیر مملکت کے معاشرہ زندہ نہیں رہ سکتا[۲] چنانچہ علامہ ماوردی فرماتے ہیں" تمام ارباب خرد فطری طور پر اپنے معاملات ایسے رہبر کے سپرد کر دینا چاہتے ہیں جو انہیں ایک دوسرے پر ظلم کرنے سے روکے اور باہمی مخاصمت میں ان کے درمیان فیصلہ کرے۔ اگر ذی اقتدار افراد نہ ہوں تو عالم میں شخصی اقتدار پھیل جائے اور تہذیب واجتماع کا شیرازہ بکھر جائے"[۳] یہ تو مملکت کی ابتدا ہوئی۔ اب رہا مقصد تو اس کے متعلق ماوردی فرماتے ہیں:" دین کی حفاظت ہو اور دنیا کا انتظام برقرار رہے"[۴] دوسرے الفاظ میں مملکت کی ابتدا اس طرح ہوئی

---

[۱] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ڈاکٹر حمید اللہ۔" دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور"۔ حیدرآباد دکن ۱۹۴۳ء نیز ملاحظہ ہو سیرۃ ابن ہشام (طبع گاٹن جن ۱۸۷۰ء) ص ۳۴۱ - ۳۴۴

[۲] پروفیسر عبدالمجید صدیقی۔ تاریخ سیاسیات ادارہ ادبیات اردو۔ حیدرآباد دکن ۱۹۴۴ء

[۳] ماوردی۔ احکام السلطانیہ (ترجمہ۔ اردو جامعہ عثمانیہ) حیدرآباد۔ ۱۹۳۱ء صفحہ ۳

[۴] " " " " " " " " " صفحہ ۳

کہ انسان ایک سماجی اور عمرانی ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ جماعت انسانی میں ضبط و نظم قائم رہے۔ مقصد سے متعلق دو چیزیں غور طلب ہیں:۔ ایک دین کی حفاظت دوسرے دنیا کا انتظام۔ اسلام کے سیاسی تصور کے مطابق یہ دونوں چیزیں لازم و ملزوم ہیں۔ اسلام میں مذہب اور سیاست جداگانہ چیزیں نہیں۔ بلکہ عبادت ایسی ہی ضروری چیز ہے جیسے سماجی قوانین کی پابندی۔ اسلامی حکمران مذہبی پیشوا بھی ہوتا ہے۔ وہ قوانین کی پابندی کراتا ہے، نماز بھی پڑھاتا ہے۔ اس کے علاوہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مملکت کے تصوّر میں اخلاقیات کو مادی منفعت پر ترجیح دی گئی ہے۔ افلاطون کی طرح اسلام بھی سیاسیات کو اخلاق کے تابع قرار دیتا ہے اور مملکت کا مقصد یہ ہے کہ افراد کے اخلاق سنوارے۔ اس کے علاوہ اسلام کی مملکت عالمگیر تصوّر رکھتی ہے، جس میں ہر قوم، نسل اور آبادی بلا امتیاز رنگ و نسل سما سکتی ہے۔ یعنی اسلامی مملکت جغرافی و نسلی حدود سے بالاتر ہے۔ اسی وجہ سے اسلام میں مملکت و سلطنت کی اصطلاح سرے سے نہیں پائی جاتی کہ اس میں نسلی و جغرافی لزوم آجاتا ہے بلکہ اسلام نے مملکت کے لئے امت کی اصطلاح استعمال کی ہے جو اپنے وسیع معنوں میں ایک اسلامی اخوت ہے۔

مملکت کے بعد اقتدار اعلیٰ کا مسئلہ ہے۔ اگرچہ اقتدار اعلیٰ کا ماخذ ربانی ہے۔ کیونکہ جس دستور کے تحت اسلامی مملکت قائم ہوئی اور حاکمِ اسلام کو اقتدار ملا، وہ من جانب اللہ ہے لیکن اقتدار خود انسان استعمال کرتے ہیں اور یہ کہنا کہ یہ اقتدار ان کو قدرت سے بطور عطیہ ملتا ہے۔ اس طرح یہ انسانی ہے۔ یہ اقتدار پہلے رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو حاصل تھا۔ چنانچہ بیعت عقبہ میں اہل مدینہ نے جناب رسالت مآبؐ کی سرداری اور اقتدار کو دل سے قبول کر لیا لیکن "خلافتِ راشدہ کے دور میں اقتدار اعلیٰ مشیت عامہ میں منتقل ہو گیا اور یہ مشیت صرف اہل مدینہ کو حاصل تھی۔" [۵] یہ مشیت بالواسطہ استعمال ہوتی تھی اور خلیفہ کا انتخاب اسی مشیت کے مطابق ہوتا تھا۔ انتخاب کرنے والے اہل اختیار اور خلافت کے امیدوار اہل امامت کہلاتے ہیں [۶] امامت کے لئے بعض مرتبہ نامزدگی بھی ہوئی۔ یعنی خلیفہ اپنی طرف سے کسی امیدوار کو نامزد کر دیتا تھا لیکن یہ نامزدگی کافی نہ تھی بلکہ رائے عامہ سے اس کی توثیق ضروری تھی۔ یہ توثیق جو افراد مملکت کی رائے دہی سے ہوتی تھی، بیعت کے نام سے موسوم ہے۔ خلفاء راشدین نے اس بات کا صاف اعلان کیا تھا کہ اگر وہ خدا اور رسول کے احکام کی

---

[۵] تاریخ سیاسیات محولہ صدر صفحہ ۱۳۹ [۶] ماوردی محولہ صدر صفحہ ۴۔ نیز ابوحفص محمد عتیق اللہ حسن المساعی الی نصح الرعیۃ والراعی۔ مطبع احمدی حیدر آباد ص۱۸

پابندی نہ کریں تو ان کو خدمت سے علیحدہ کر دیا جائے۔ گویا منتخب خلیفہ کے ساتھ جب تک مشیت عامہ ہوتی، وہ خلیفہ رہ سکتا تھا۔ خلیفہ صرف صدر عاملہ تھا اور اس کو قانون سازی یا عدل گستری سے زیادہ واسطہ نہ تھا۔ کیونکہ قانون سازی اور تعبیر و قیاس فقیہوں کے ہاتھ میں تھی اور عدلیاتی اختیار قاضی استعمال کرتے تھے۔

مسلمانوں کے سیاسی تصور میں مملکت اور حکومت کا واضح فرق نہیں پایا جاتا۔ مسلمان مفکر امت سے مملکت مراد لیتے ہیں اور خلافت سے حکومت۔ خلافت کے اعضا میں خلیفہ اور اس کی مجلس عاملہ، مقننہ یعنی فقہاء اور عدلیہ یعنی قضاۃ شامل تھے۔ اسلامی حکومت کے یہ تینوں اعضاء معین تھے۔ اور ایک دوسرے کے اختیارات میں مداخلت نہیں ہوتی تھی۔ گویا یہ کہنا چاہیئے کہ تفریق اختیارات کا یہ تصور مان ٹسکے سے ایک ہزار سال پہلے پیدا ہو چکا تھا۔ مسلمان مفکروں نے حکومت کی قسمیں نہیں بتائیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہاں صرف ایک ہی طرز حکومت جمہوریّت تھی۔ لیکن بعد کے زمانے میں حکومت کی مختلف صورتوں کا تجربہ ہوا چنانچہ شروع کی جمہوریت کے بعد بنی امیہ کے دَور میں اعیانیت داخل ہو گئی۔ جس میں اعیانِ خاندان حکومت کرتے تھے۔ بنی عباس کے زمانے میں شخصی، اعیانی اور عمومی تینوں عناصر مخلوط ہو گئے۔ اور انگلستان کے دستوری بادشاہوں کی طرح خلفاء بھی دستوری ہو گئے۔ چنانچہ خلیفہ کے عاملانہ اختیارات وزراءِ تفویض استعمال کرتے تھے۔ جس میں خلیفہ مداخلت نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن اس استعمال میں بھی وہ قوم کے سامنے ذمہ دار تھے۔ ان کو ہمیشہ اجماع امت کا ڈر تھا۔ اس کے علاوہ جب وزیرِ تفویض برخاست ہوتا تو اس کے ساتھ اس کے تمام ماتحت وزراء بھی برخاست ہو جاتے تھے۔ یہ نظام کابینہ کی صورت تھی۔ اس میں ذمہ داری کا بڑا پہلو مضمر تھا۔ اسلام میں خلافت ہو یا چھوٹی چھوٹی سلطنتیں شخصی اور جابرانہ حکومت کا تصوّر نہیں ہے۔ کیونکہ اسلامی حکومت تفریقِ اختیارات کی تابع ہے۔ خلیفہ یا بادشاہ صرف عاملانہ عہدہ دار ہوتا ہے جو نہ قانون بنا سکتا ہے اور نہ عدلیاتی اختیار رکھتا ہے۔ اس طرح اسلامی حکمران شخصی و جابر حکمران نہیں ہو سکتے"[۱]

اسلامی تصوّرِ قانون و عدل

اسلامی قانون کے اصل ماخذ، جس میں قانون دستوری اور قانون ملک دونوں شامل ہیں، قرآن اور

---

[۱] تاریخ سیاسیات محولہ صدر صفحہ ۱۴۴

حدیث ہیں اور یہ ربانی ماخذ ہیں۔ لیکن مرور زمانہ کے ساتھ اس میں خلفاء راشدین اور صحابہ کرام کا عمل بھی شامل ہو گیا جس کا مرجع بھی اسلامی قوانین کے اساسی سرچشموں یعنی الکتاب والسنت پر مشتمل تھا۔ نیز امت کو خدا کی طرف سے قیاس کا جو حق عطا ہوا ہے، اس کے ذریعہ بھی قانون سازی ہوتی رہی۔ اور جو نتائج اس سے پیدا ہوتے تھے۔ ان کو اپنی عملی زندگی میں شریک کر کے مسلمان ان کی توثیق کرتے تھے۔ اسی طرح اجماع بھی اسلامی قانون کی ایک اہم بنیاد ہے جس کے ذریعہ ایسی باتوں کو اتفاق کی قوت سے قانون کا قطعی جزو بنا دیا جاتا ہے جس کے ثبوت میں کچھ ابہام ہو۔ اس سے ظاہر ہے کہ مشیت عامہ اسلامی قوانین کے فلسفہ میں منجملہ دیگر موثرات کے ایک بڑا اہم موثر ہے۔ یوں تو فقہاء ہی اسلام کے قانون ساز سمجھے جاتے ہیں جو قرآن و حدیث کی صحیح تعبیر و توضیح اور تاویل کرتے ہیں لیکن غور سے دیکھا جائے تو کسی ایک فقیہ کا فیصلہ تسلیم نہیں کیا جاتا بلکہ اس فیصلے سے جمہور علماء کا اتفاق ضروری ہے اور علماء کے پیچھے مشیت عامہ ہوتی ہے یعنی امت اپنی طرف سے فقہاء کو اجتہاد کا حق دیتی ہے۔ ائمہ اجتہاد میں سے جن بزرگوں کے فیصلوں کو مسلمانوں نے عموماً تسلیم کیا ہے، ان ہی کے اجتہادی نتائج قابل تسلیم قرار دیئے گئے ہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان فقہی قوانین میں جو اہمیت پیدا ہوئی اس میں مسلمانوں کے عام اتفاقی رجحانات کو بھی دخل ہے۔ بہر حال علماء کے پیچھے یقیناً مشیت عامہ بھی ہے۔ یعنی امت اپنی طرف سے فقہاء کو اجتہاد کا حق دیتی ہے [۸]۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اساسی احکام کے علاوہ جنہیں ربانی کہنا چاہیئے۔ مرور زمانے کے ساتھ اس مشیت عامہ کے زور سے فقہ میں ایک زبردست ارتقا ہوا [۹]۔ چنانچہ موجودہ زمانے میں قوانین اسلام کا جو مجموعہ ہے، وہ اسی ارتقاء کا نام ہے۔ اسلامی قانون

---

[۸] عبدالحفیظ صدیقی: اسلامی عدل گستری ۱۹۴۷ء۔ ص ۸

[۹] فقہ کے اس تدریجی ارتقاء کے لئے ملاحظہ ہو مصر کے علامہ خضری کی "تاریخ التشریع الاسلامی" جس کا "تاریخ فقہ اسلامی" کے نام سے اردو ترجمہ عبدالسلام ندوی (اعظم گڑھ ۱۳۴۶ھ) نے کیا ہے۔ نیز ملاحظہ ہو:

DR. AGHNIDES, N.P. - MOHAMADAN THEORIES OF FINANCE, (NEW YORK 1961), PART 1, PP. 23-156.

AND VON HAMMER IN ENCYCLOPADISCHE UEBER SICHT DES.

جس میں اس پورے نظام قانون پر سیر حاصل تبصرہ ہے۔ نیز ملاحظہ ہو انسائیکلوپیڈیا آف سوشل سائنسس جلد ۸ ص ۳۴۴ ڈاکٹر حمید اللہ۔ امام ابو حنیفہ کی تدوین فقہ اسلامی ۱۹۴۳ء حیدرآباد نیز دیکھیئے جوسف شاخت، کولسن، ولسن، عبدالرحیم وغیرہ

یعنی شریعت اخلاقی وجوب اور فرائض پر بھی زور دیتا ہے اور مسلمانوں کی مذہبی اور گھریلو زندگی کے علاوہ ان کی سیاسی اور معاشری زندگی کے تمام شعبوں پر بھی حاوی ہے۔ چنانچہ شریعت میں مذہب اور مذہبی فرائض سے متعلق احکام کے علاوہ افراد ملت کے باہمی تعلقات اور ضبط و نظم کے بھی احکام ہیں۔ نیز انسانی زندگی کے ہر شعبے سے متعلق بھی تفصیلی قواعد اور اصول پائے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فقہ اسلامی کے ارتقاء میں زندگی کی ضروریات کو نمایاں جگہ دی گئی اور "اصل[10]" محض ایک ثانوی چیز بن کر رہ گئی[11] اس کے باوجود شریعت ایک مقدس قانون ہے جو خاص طور پر قانون تفقہ[12] کہلا سکتی ہے[13]

اگرچہ ہر قوم اور ہر تہذیب میں انصاف کا کچھ نہ کچھ تصوّر موجود ہے لیکن یہ تصوّر ہر زمانے میں اور ہر جگہ ایک نہیں رہا۔ بلکہ ہر قوم اور ہر زمانے نے "عدل" کو ایک خاص تخیل اور زاویہ نگاہ سے دیکھا اور ہر زمانے میں "سزا" کا معیار جداگانہ رہا۔ جس طرح ہر زمانے میں اخلاق کا معیار، سماجی برائیوں کو جانچنے کے ڈھنگ اور سیاسی خرابیوں کو دُور کرنے کے طریقے مختلف رہے ہیں۔ اسی طریقہ سے عدل و سزا کے معیار بھی مختلف ہیں۔ اسلام نے قرون وسطیٰ میں انصاف اور عدل سے متعلق جو تصوّر پیش کیا وہ دنیا کے لئے بالکل انوکھا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اسلام میں خلیفہ یا سلطان سرچشمۂ انصاف نہیں بلکہ پوری مسلم جماعت ہے اور انصاف صرف اللہ کے نام سے کیا جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اسلام نے عدل گستری کو مملکت کا اوّلین اور ضروری فرض قرار دیا۔

کتاب اللہ میں عدل کا جو تصوّر بتایا گیا ہے، وہ ذیل کی چند آیتوں سے واضح ہو سکتا ہے:

(۱) ان اللہ یامر بالعدل والاحسان۔ یعنی اللہ عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے۔

(۲) ولا یجرمنکم شنان قوم علی الا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقوی۔ یعنی کسی کے بغض کی وجہ سے ناانصافی پر آمادہ نہ ہونا چاہیئے بلکہ عدل کرنا چاہیئے جو پرہیز گاری کا تقاضا ہے۔

(۳) وجزاء سیئة سیئة مثلھا فمن عفا و اصلح فاجرہ علی اللہ (۴۲: ۴۰) یعنی بُرائی

---

[10] JURIDICAL [11] انسائیکلوپیڈیا آف سوشل سائنس جلد ۸ ص ۳۴۴

[12] JURIST'S LAW

[13] انسائیکلوپیڈیا آف سوشل سائنس جلد ۸ ص ۳۴۴

اسی قدر برائی سے دیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر کوئی معاف کر دے اور صلح کرے تو خدا اس کا اجر دے گا۔

(۴) وان طائفتان من المومنین اقتتلوا فاصلحوا بینھما ۔ ۔ ۔ ۔ ان اللہ یحب المقسطین (۹:۴۹)

یعنی جب مسلمانوں کی دو جماعتیں آپس میں لڑ پڑیں ان میں آپس میں صلح کرا دو اور اگر ان میں سے ایک جماعت دوسرے پر زیادتی کرے تو تم اس سے لڑو جو زیادتی کرتی ہے تا آنکہ وہ اللہ کے حکم ماننے پر اتر آئے اور اگر وہ اس پر آجائے تو پھر ان دونوں کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کراؤ اور درمیانہ روی کے ساتھ عمل کرو اللہ انصاف کرنے والوں کو چاہتا ہے۔

(۵) یاداؤد انا جعلنٰک خلیفۃ فی الارض فاحکم بین الناس بالحق ولا تتبع الھوی فیضلک عن سبیل اللہ (۳۸-۲۶) یعنی اے داؤد ہم نے تم کو زمین میں اپنا خلیفہ بنایا اس لئے تم لوگوں کے درمیان حق پر فیصلہ کرو اور خواہش کی پیروی مت کرو کیونکہ اس سے تم اللہ کے راستے سے ہٹ جاؤ گے۔

(۶) سب سے اہم آیت اس باب میں یہ ہے: یاایھا الذین امنوا کونوا قوامین بالقسط ۔ ۔ تعلمون خبیراً ○ (النساء - آخر) یعنی اے ایمان والو! انصاف پر قائم رہو۔ اللہ کی طرف گواہی دو۔ اگرچہ اپنا یا ماں باپ یا قرابت والوں کا نقصان ہو۔ اگر کوئی غنی یا محتاج ہے تو اللہ تم سے زیادہ ان کا خیر خواہ ہے۔ اس لئے تم اپنے جی کی بات نہ مانو۔ اگر تم بات بدل ڈالو یا کسی کو بچانے کی کوشش کرو تو اللہ تمہارے کام سے واقف ہے

قرآنی تصور[14] کے بعد جناب رسالت مآب صلعم کا تصور عدل قابل غور ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت نے سلطان کو زمین پر ظل اللہ بتایا۔ اگر سلطان انصاف کرے تو اللہ کے نزدیک اس کا اجر ہے اور ظلم کرے تو سلطان پر اس کا بوجھ ہے[15] حضرت عائشہ نے جناب رسالت مآب صلعم کا یہ قول بیان فرمایا کہ سایۂ الٰہی میں سب سے پہلے وہ لوگ جائیں گے، جو اپنا حق ملنے پر اسے قبول کر لیتے ہیں اور دوسروں کا حق بخوشی دے دیتے ہیں[16] حضرت ابو سعید خدریؓ نے یہ قول بیان فرمایا کہ اللہ کے محبوب لوگوں

---

[14] قرآن حکیم کی دیگر آیتیں بھی ملاحظہ ہوں (۶ : ۱۶۶ و ۶۵ : ۲ و ۲ : ۲۸۳ و ۲ : ۴۰ و ۲ : ۲۸۲ و ۲ : ۳۰ و ۲۵ : ۶۷ وغیرہ)

[15] مشکوٰۃ شریف بحوالہ محمد بن عبداللہ : حبل المتین (حیدر آباد دکن ۱۳۲۲ھ) صفحہ ۸

[16] " " " " " " صفحہ ۹

یں حکام عادل ہیں اور مبغوض ترقیامت میں اور سخت عذاب والے ظالم ہیں[17] ابو سعید اور طارق بن شہاب سے مروی ہے کہ آنحضرت صلعم کے خیال میں سب سے بڑا جہاد یہ ہے کہ ایک شخص کسی حاکم جابر کے سامنے حق اور انصاف کی بات کہنے سے نہ چوکے[18] ایک اور حدیث یہ ہے کہ جب انسانوں کے معاملات کسی کے سپرد ہوں اور وہ مسلمانوں یا مظلوموں کے لئے اپنا دروازہ بند کردے تو خدا اس پر بھی اپنے رحم کا دروازہ بند کردے گا[19] ایک اور حدیث مشہور ہے کہ ایک منٹ جو انصاف میں صرف ہو، ستر سال کی عبادت و ریاضت سے بہتر ہے[20] عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ منصف اور عادل حکام خدا سے بہت قریب ہوں گے۔ عبداللہ بن اوفی نے سرکار دو عالم صلعم کا یہ قول بیان فرمایا کہ حاکم جب تک ظلم نہ کرے اس وقت تک اللہ اس کے ساتھ رہتا ہے، اور جب حاکم ظلم کرتا ہے اللہ اس کو چھوڑ دیتا ہے اور شیطان اس کے ساتھ ہو جاتا ہے[22] بریدہؓ سے ایک حدیث روایت ہے کہ حاکم تین قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو حقوق کو تسلیم کرتے ہیں اور اسی لحاظ سے فیصلے کرتے ہیں۔ یہ جنت میں جائیں گے۔ دوسرے وہ جو حقوق کو تسلیم کرتے ہیں لیکن فیصلے غلط اور لوگوں کے حق کے خلاف کرتے ہیں، یہ دوزخ میں جائیں گے۔ تیسرے وہ لوگ ہیں جو لوگوں کے معاملات کے فیصلے ناواقفیت کے ساتھ کرتے ہیں۔ یہ بھی دوزخ میں جائیں گے[23] عبداللہ بن عمرؓ اور ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ جب حاکم عدالت فیصلہ کرتا ہے اور اپنے فیصلے کے لئے کافی غور کرتا اور صحیح نتیجہ پر پہنچتا ہے تو اس کے لئے دو انعام مقرر ہیں اور وہ کافی غور کے باوجود اپنے فیصلے میں غلطی کرے تو اس کے لئے ایک انعام ہے[24] حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ جب تمہارے پاس دو فریق فیصلے کے لئے آئیں تو دونوں سے پورے حالات سنے بغیر فیصلہ مت کرو[25] حضرت ابوبکرؓ سے روایت ہے کہ جب قاضی غصہ کی حالت میں ہو تو اسے فیصلہ نہیں کرنا چاہئے۔[26]

---

[17] جامع ترمذی۔ ص۹

[18] مرزا ابوالفضل: Sayings Of The Prophet Mohamad الہ آباد ۱۹۲۴ء صفحہ ۷۶ حدیث (۳۰۸) [19] ایضاً صفحہ ۸۹ حدیث (۳۶۷)

[20] ماخوذ نہایۃ العرب، قریشی صفحہ ۱۵۴ [21] بخاری و مسلم

[22] جامع ترمذی بحوالہ حبل المتین محولہ صدر ص۹ [23] تا [26] عبدالحفیظ صدیقی: اسلامی عدل گستری۔ ص۲۴ (بحوالہ بخاری، مسلم، ترمذی وغیرہ)

غرض قرآن اور حدیث میں عدل و انصاف سے متعلق اس طرح کے بیسیوں احکام اور ہدایتیں ملتی ہیں۔ ان کا نچوڑ صرف یہ ہے کہ حاکمِ عدالت کو چاہیئے کہ اپنے ضمیر کو سامنے رکھ کر کافی غور اور تحقیق کے بعد فیصلہ کرے۔ عدل گستری کو انسانی فرائض میں داخل کیا گیا ہے۔ انصاف کے لئے معاوضہ لینے کا حکم نہیں ہے کھلی عدالتی کارروائی پر زور دیا گیا ہے اور قرآن و حدیث میں جو احکام بتائے گئے ہیں ان کے مطابق فیصلے ہونے چاہیئں نیز عرف اور عادۃ اور انصاف کا لحاظ بھی رکھا گیا ہے۔ سچ پوچھیئے تو قرآن و حدیث اور خلفاء راشدین کے طرزِ عمل سے افلاطون کے "عدل مطلق" کو حقیقی معنوں میں علمی جامہ پہنایا گیا۔ یہ بنتھم کے اس خواب کی کہ عدل گستری مفت ہونی چاہیئے، صدیوں پہلے کی تعبیر ہے۔

مملکت، اقتدار اعلیٰ، حکومت، قانون اور عدل کے متعلق اسلامی تصورات کا مطالعہ کرنے کے بعد اب یہ دیکھنا چاہیئے کہ اسلامی عدل گستری کی سوتیں کہاں سے نکلتی ہیں۔

اسلامی عدل گستری کے ماخذ

اسلامی عدل گستری کے ماخذوں میں سب سے پہلے زمانہ جاہلیت کے رسم و رواج ہیں کیونکہ اسلام میں زمانہ جاہلیت کی اچھی باتوں پر بھی عمل کیا جاتا ہے[27]۔ جاہلیت کے فضائل ایک طرح سے اسلامی عدل گستری کے ماخذ ہیں۔ اس لئے اسلامی عدل گستری کے سلسلے میں زمانہ جاہلیت کے نظام عدل گستری کا مطالعہ لازمی ہے۔

(۱) عدل گستری زمانہ جاہلیت میں

اسلام سے پہلے عربوں میں "عہدیت"[28] کا ایک نظام پایا جاتا تھا۔ اسے مختلف خانہ بدوش قبیلوں کے باہمی میل جول کا نتیجہ سمجھنا چاہیئے۔ زمانہ حال کی اصطلاح میں "مملکت" کا ابھی تک وجود تھا اور نہ عدل گستری کے لئے کوئی منظم حکومت قائم تھی۔ حکومت اصل میں عام عمل درآمد اور رسم و رواج کا نام تھی۔ اور لوگوں کے باہمی جھگڑوں اور مناقشوں کا تصفیہ بھی قدیم رسم و رواج کے تابع تھا۔ قبیلوں میں بعض مرتبہ سبھائیں منعقد ہوتی تھیں اور ان کے متعلق یہ خیال ہو سکتا ہے کہ وہ جدید قانون بناتی ہوں گی لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ قانون سازی نہیں کرتی تھیں بلکہ وہ قدیم اور از زیادرفتہ رسم و رواج کی پابندی کرواتی تھیں۔

---

[27] یا سائب انظر اخلاقك التی کنت تصنعها فی الجاهلیة فاجعلها فی الاسلام۔ یعنی اے سائب! ان اچھے اخلاق کی پابندی کرو جن کو تم ایام جاہلیت میں پیش نظر رکھتے تھے۔ ان کو اسلام میں بھی روا رکھو۔ مسند احمد بن حنبل جلد ۳ طبع حیدر آباد ۱۳۱۰ھ صہ۴۲۵

[28] کنفیڈریشن۔

اس رسم و رواج کے پیچھے قبائلی رائے عامہ ہوتی تھی اور یہی وہ اخلاقی قوت تھی، جسے زمانہ حال کی اصطلاح میں تہدید (SANCTION) کہنا چاہیئے۔ اس طرح قدیم عربوں میں عدلیہ اور عاملہ کے چند دھندلے ادارے تو مل جاتے ہیں لیکن ان کے ہاں ایسا کوئی ادارہ قانون سازی نہ تھا جس کو مقننہ کہہ سکیں اور یہ کمی اسلام نے پوری کی۔

عرب زمانۂ جاہلیت میں عدل گستری کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ چنانچہ عربی زبان میں "حکمرانی" اور "فصل خصومات" کے لئے ایک ہی لفظ یعنی "حکم" استعمال ہوتا ہے۔ اس میں حکومت اور عدل گستری کے دونوں پہلو مضمر ہیں۔ اور اسی سے عربوں میں عدل گستری کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے[29] طلوع اسلام سے عین قبل مکہ میں ایسے رجحانات پائے جاتے تھے، جن کو منظم حکومت کا پیش خیمہ سمجھنا چاہیئے۔ شہر میں مستقل رہائش رکھنے والے مختلف قبیلے تھے اور مختلف خدمتیں ذی اثر قبیلوں یا خاندانوں میں تقسیم ہو گئی تھیں۔ چنانچہ ایک قبیلہ کے سپرد تنازعات کا تصفیہ تھا اور سردار قبیلہ یہ فرض انجام دیتا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے بھی یہ خدمت انجام دی تھی۔ اگر ایک قبیلہ کا آدمی دوسرے قبیلے کے آدمی کی جان لے لے تو مجرم کو قتل کیا جاتا تھا۔ مجرم کو قتل کرنے کا حق مقتول کے ورثاء یا سردار قبیلہ کو پہنچتا تھا لیکن جرمانہ یا ایک سو اونٹ کے معاوضہ پر راضی نامہ بھی ہو سکتا تھا۔ چند آدمیوں کے قسم کھانے پر بھی کہ مجرم نے قتل نہیں کیا، معاملہ ختم کیا جاتا تھا۔ جرائم کی بہت سخت سزائیں ہوتی تھیں۔ چوروں کے ہاتھ کاٹنا سرقے کی عام سزا تھی۔ زانیوں کو سنگسار کیا جاتا تھا یا ان کے چہرے سیاہ کئے جاتے اور پھر ان کے کوڑے لگائے جاتے۔ معمولی مضرتوں کے لئے خون بہا طلب کیا جاتا تھا[30] لیکن عرب جاہلیت میں جنسی تعلقات اور وراثت سے متعلق کوئی معین اصول نہ تھے[31] طلاق کے مختلف طریقے رائج تھے لیکن اس کے متعلق بھی کوئی واضح اصول نہ تھا[32]

اسلام نے جاہلیت کے بعض رسم و رواج سے فائدہ تو اٹھایا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے صرف ان رسوم سے استفادہ کیا جو بالکل قرین عقل اور قرآنی احکام کے مطابق تھے[33] لیکن جو عقل سلیم اور پاکیزہ ضمیر کے خلاف تھے، وہ سب ترک کر دیئے گئے۔ (باقی آئندہ)

---

[29] WELLHAUSEN بحوالہ ڈاکٹر حمید اللہ مجلہ عثمانیہ جلد ۱۱ شمارہ (۱ و ۲) ۱۳۴۸ھ مفضلی ص ۱۷

[30] محمد اللہ صفحہ ۱۱۔ تفسیر احمدی طبع بمبئی ص ۷۵۔ کشف الغمہ جلد ۲ طبع مصر، صفحات ۶ و ۱۰۵

[31] MAHOMAD ULLAH: THE MUSLIM LAW OF MARRIAGE, (ALLAHABAD 1926), PP. I-XV.

[32] ایضاً صفحہ ۶۶